انا الحق

ضیا تسنیم بلگرامی ★

فارس کے شہر بیضا کو یہ فخر حاصل ہے کہ ۲۲۴ھ میں وہاں ایک ایسی حق گو اور بے باک ذات پیدا ہوئی جس کا تاریخِ انسانی میں کوئی جواب نہیں ملتا۔ افکار اور کردار میں اتنی تندی اور تیزی کہ بڑے بڑے ہم عصر خوف زدہ ہو کے ان سے دُور ہو گئے اور ان کی ہم خیالی اور ہم مشربی سے برأت کا اظہار کرنے لگے۔ کئی صوفی ان کے ہم عقیدہ تھے لیکن جب سزا جھیلنے کا وقت آیا تو یہ اکیلے رہ گئے لوگ ان پر افسوس بھی کرتے تھے اور ہنستے بھی تھے لیکن لوگوں کی ہنسی یا افسوس کا خود ان پہ کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

نوعمری ہی میں یہ عراق کے شہر واسط چلے آئے اور یہیں رہنے لگے۔ واسط کے لوگوں نے دیکھا، ایک نوعمر خاموش طبع انسان نظریں جھکائے، دنیا و مافیہا سے غافل کسی فکر میں غلطاں و پیچاں اِدھر اُدھر آتا جاتا رہتا ہے، اپنی ذات میں گم، جیسے کسی شے کی جستجو اسے اِدھر اُدھر بھگائے پھر رہی ہو۔ اس کے چہرے اور چال میں غیر معمولی مشابہت پائی جاتی تھی۔ چال کا اضطراب چہرے پر بے چینی اور تجسس بن کر ہویدا رہتا۔ لوگ اس خاموش طبع لیکن بے چین انسان کو دلچسپی سے دیکھتے اور کبھی کبھی کوئی پھبتی بھی کس دیتے لیکن اس کا اس شخص پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

دکان میں رُوئی بھری ہوئی تھی اور دکان دار تنہا کسی کا منتظر تھا۔ اس کی نظر جیسے ہی اس خاموش طبع شخص پر پڑی، اس نے آواز دی "اے بھائی حسین! ذرا یہاں تو تشریف لائیے گا!"

گم سُم، اپنے حال میں مگن نوجوان نے چونک کر دکان دار کی طرف دیکھا اور پوچھا "آپ نے کچھ مجھ سے فرمایا؟"

"ہاں بھائی! میں نے آپ ہی کو آواز دی تھی۔ ذرا ادھر آجائیے میری دکان میں میرے پاس۔"

یہ نوجوان، اس رُوئی والے کی دُکان میں داخل ہو گیا اور کہا "فرمائیں، مجھ سے کیا کام ہے؟"

دکان دار نے کہا "بھائی حسین! مجھے ایک ضروری کام سے کہیں جانا ہے، کیا تھوڑی دیر کے لیے آپ میری دُکان میں بیٹھنا گوارا کریں گے؟"

"بالکل بیٹھ جاؤں گا۔" یہ کہہ کر نوجوان دکان میں ایک طرف بیٹھ گیا۔

دکان دار نے کہا "میں ابھی واپس آجاؤں گا، آپ گھبرائیں نہیں۔" اس کے بعد جاتے جاتے کہا "بھائی حسین! میں یہ رُوئی دھنک کر جانا چاہتا تھا تاکہ بعد میں گاہکوں سے شرمندگی نہ اٹھانا پڑے لیکن دیر اتنی ہو گئی ہے کہ یہ دھنکنے کا کام واپس آکر انجام دینا پڑے گا۔"

دکان دار اپنی روئی کی دکان حسین پر چھوڑ کے چلا گیا۔ جب واپس آیا تو اس نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ حسین رُوئی کی گانٹھوں کے سامنے کھڑے ہاتھ کے اشارے سے کہہ رہے تھے "رُوئی الگ، بنولے الگ!"

یہ منظر کتنا دلکش اور اثر انگیز ہوگا کہ حسین کے حکم پر رُوئی خود بخود دھنک کر ایک طرف جمع ہونے لگی اور اس کے بنولے اُڑ اُڑ کر ایک کونے میں ڈھیر ہونے لگے۔

دُکان دار نے خوف زدہ ہو کر پوچھا "حسین! تم یہ کیا کر رہے ہو؟"

حسین نے مسکرا کر جواب دیا "وہی کام جو تم نہیں کر سکے تھے۔ میں نے سوچا تمہاری واپسی تک میں خود کیوں نہ کر دوں۔"

دکاندار نے خوف زدہ ہو کر کہا "تم نے تو ایک طرح سے

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

تذکرۃ الاولیاء (فرید الدین عطار) ★ خزینۃ الاصفیاء (مفتی غلام سرور) ★ تذکرۂ اولیاء (رئیس احمد جعفری) ★ سفینۂ اولیاء (دارا شکوہ) ★ طبقات الاولیاء (علامہ شعرانی) ★ جنیدِ بغداد (ترجمہ (مصری سے))

جادو کر دیا۔"

"نہیں، اسے جادو نہیں کہتے، میں تو اسی کوشش میں ہوں کہ اپنی ذات سے بنولے اور رُوئی کی طرح دُھنک کر نکال باہر کروں۔"

دُکان دار ان کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا لیکن اپنی ذہنی استطاعت بھر ان کی عزت افزائی ضرور کی اور ان سے ہنس کر کہا "بھائی حسین! اگر تم بُرا نہ مانو تو ایک گزارش کروں؟"

"کرو گزارش!" حسین نے جواب دیا۔

دُکان دار نے کہا "حضرت! آپ نے چونکہ میری رُوئی دُھنک دی ہے اس لیے میں آپ کو حسین بن منصور حلاج کہا کروں گا، حلاج اس لیے کہ آپ نے میری رُوئی دُھنک دی ہے!"

نوجوان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اُٹھا اور دُکان سے اُٹھ کر چلا گیا۔

یہ رُوئی والا واقعہ آناً فاناً پورے شہر میں مشہور ہو گیا اور لوگوں کی توجہ اس خاموش طبع اور بے چین فطرت نوجوان پر مرکوز ہو گئی۔ وہ اس سے کسی اور کرامت کی اُمید کر رہے تھے لیکن نوجوان حسین کسی اور ہی کرب و اذیت میں مبتلا تھا، وہی دُوئی مٹانے کی فکر۔ ذاتِ احدیت میں گم ہو جانے کی کوشش۔ اسی فکر اور کوشش میں اہواز کے شہر تستر کا رُخ کیا کیونکہ تستر میں سہل بن عبداللہ نامی ایک نہایت مشہور و معروف صاحبِ عرفان ذات موجود تھی۔ یہ شب و روز ان کی صحبت میں رہنے لگے۔ اندر شوریدگی تھی کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔

عمر کے ساتھ ساتھ اس میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سہل بن عبداللہ نے حسین کو اپنی قربت کا شرف بخشا تو ضرور تھا لیکن انھیں جلد ہی اس خطرے کا احساس ہو گیا جو یہ نوجوان اپنی ذات میں چھپائے پھر رہا تھا۔ انھوں نے دورانِ گفتگو کئی بار یہ محسوس کیا کہ حسین ان کی صحبت سے مطمئن نہیں ہے اور اندرونی جوش اور جذبے سے مغلوب ہو کر ایسی باتیں کہہ گزرتا ہے جو برسرِ عام کہنے کی نہیں ہوتیں۔ ایسے بھید جن کا دل میں القا تو ہوتا ہے لیکن ان کے اظہار اور انکشاف کی اجازت نہیں ہوتی۔ سہل بن عبداللہ نے حسین کو خلوت میں بلا کر سوال کیا "حسین! ہمیں خوشی ہے کہ تم جیسا صاحبِ حال مرید خدا نے ہمیں عطا فرمایا، لیکن تمھاری کچھ باتیں ایسی ہیں جن سے ہمیں ڈر لگنے لگتا ہے۔"

حسین نے پوچھا "مثلاً کون سی باتیں؟"

سہل بن عبداللہ نے جواب دیا "ہر وہ راز جو خدا اپنے رازداں بندوں کے دلوں پر منکشف فرماتا ہے، ایسا نہیں ہوتا کہ اس کا برملا اظہار کیا جائے یہ تو نری جذباتیت ہے اور ایک طرح سے کم ہمتی بھی کہ ہم تو اپنے کسی مرید کو خصوصی توجہ کا مستحق سمجھ کر اپنا ہمراز بنا لیں اور وہ مرید ہمارے رازوں کا چرچا کرتا پھرے۔ خدا اور تصوّف کے معاملے میں تمھارا طرزِ عمل ایسا ہی ہے۔"

حسین نے تلخی سے پُرجوش لہجے میں کہا "کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں جو کچھ کرتا ہوں، اس میں میرے اختیار اور ارادوں کا دخل ہوتا ہے؟"

سہل بن عبداللہ نے جواب دیا "حسین! تم اس بحث میں مت پڑو کیونکہ زیرِ بحث موضوع خود بخود مسئلہ جبر و قدر کی طرف منتقل ہوتا نظر آ رہا ہے، معلوم نہیں تم ذہنی طور پر جبریہ سلسلے سے تعلق رکھتے ہو یا قدریہ مسلک سے لیکن باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تم جبریہ ہو۔"

حسین نے تند و تیز لہجے میں کہا "میں اپنی وارداتِ قلبی اور انکشافاتِ رُوحانی چھپا نہیں سکتا اور انھیں اس لیے نہیں چھپا سکتا کہ وہ ذات جس کے یہ راز ہیں وہ خود نہیں چاہتی کہ میں انھیں راز رکھوں۔"

سہل بن عبداللہ نے پوچھا "یہ تمھیں کس طرح معلوم ہوا کہ خدا خود نہیں چاہتا کہ تم اس کا راز، راز نہ رکھو۔"

حسین نے جواب دیا "اگر وہ چاہتا کہ اس کا راز، راز رہے تو مجھے اس کے راز رکھنے کا حوصلہ بھی عطا فرماتا اور پھر یہ کہ ایک طرف تو وہ عالم الغیب ہے، چھپی ہوئی باتوں کا جاننے والا اور دوسری طرف اس کی لاعلمی کا یہ عالم ہے کہ اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ اپنے جن رازوں کا میرے دل پر القا فرما رہا ہے، انھیں میں فاش کر دوں گا۔"

سہل بن عبداللہ اس گستاخ لب و لہجے پر کانپ گئے، بولے "حسین بس کرو، اب زیادہ کچھ سُننے کی ہم میں تاب نہیں ہے؟"

اس گفتگو نے دونوں کو ایک دوسرے سے دل برداشتہ کر دیا۔ حسین نے سہل بن عبداللہ کا ساتھ چھوڑ دیا اور بصرے چلے گئے۔ بصرے میں عمر بن عثمان مکی کا بڑا شہرہ تھا اور اس عہد کی نہایت برگزیدہ شخصیتیں آپ کی مریدی کا شرف رکھتی تھیں۔ جب حسین بن منصور نے ان کی خدمت میں باریاب ہو کر اپنی حاضری کا مقصد بیان کیا تو عمر بن عثمان نے دریافت کیا "کہاں سے آ رہے ہو؟"

حسین نے جواب دیا "سہل بن عبداللہ کے پاس سے۔"

عمر بن عثمان نے سوال کیا: "ان کا دامن کیوں چھوڑ دیا؟"

انھوں نے جواب دیا: "وہ مصلحت اندیش تھے میں مصلحت فراموش، میں صاف گو ہوں وہ خاموش طبع، وہ سست رو تھے اور میں تیز رو، ہم دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا، پھر دونوں یک جا کس طرح رہ سکتے تھے؟"

عمر بن عثمان نے اس تیز و طرار نوجوان کو نظر بھر کے دیکھا اور کہا۔ "اچھا تو یہ بات ہے لیکن تم ٹکتے یہاں بھی نہیں نظر آتے، ایسا لگتا ہے کہ تم اپنی آگ میں خود ہی جل مرو گے۔" پھر پوچھا: "ذرا ہمارے ایک سوال کا سوچ سمجھ کے جواب تو دینا۔"

حسین نے کہا: "کیجیے سوال!"

عمر بن عثمان نے کہا: "اگر حاکمِ وقت یا امیر المومنین تمھیں اپنے اعتماد میں لے کر اپنے چند راز تم پر منکشف فرما دیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیں کہ خبردار جو انھیں کسی اور پر ظاہر کیا، اگر سہواً بھی اس خطا کے مجرم ٹھیرے تو تمھیں قتل کر دیا جائے گا، ایسی صورت میں تم کیا کرو گے؟"

حسین نے بے باکی سے جواب دیا: "میں ان رازوں کو ہر ایک پر ظاہر کر دوں گا۔"

عمر بن عثمان نے غصے اور کراہیت سے پوچھا: "کیا مطلب؟ یعنی تم ان رازوں کو اپنے سینے میں نہیں رکھو گے؟"

حسین نے اطمینان سے جواب دیا: "جناب یہ سوچنے کی بات ہے کہ جو راز حاکمِ وقت یا امیر المومنین خود اپنے سینے میں نہ رکھ سکیں، وہ دوسروں سے اخفائے راز کی کس طرح توقع کریں گے، رہا سزائے موت کا مسئلہ تو میں ہر وقت اپنا سر دینے کو تیار رہوں اور اس یقین کے ساتھ اپنی جان دوں گا کہ میں بے گناہ مارا جا رہا ہوں کیونکہ میں ایک ایسے جرم کا مرتکب ٹھیرایا گیا ہوں جس جرم کا ارتکاب حاکمِ وقت یا امیر المومنین پہلے ہی کر چکے ہیں۔"

"گستاخ! تیری باتوں میں موت کی بو پائی جاتی ہے۔" عمر بن عثمان نے کہا: "ہم جانتے ہیں کہ تو کیا ہے اور تیرے دامن سے کتنے فتنے چمٹے ہوئے ہیں، سب کچھ جاننے کے باوجود ہم تجھے اپنی صحبت میں رکھیں گے اور کوشش کریں گے کہ تیری جان بچ جائے۔"

حسین نے ان کا شکریہ تک نہیں ادا کیا، چپ چاپ ان کی خدمت میں رہنے لگے۔

چند ہی دنوں میں عمر بن عثمان کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ مرید ضرورت سے زیادہ تلخ ہے اور اس کی جرأت و جسارت میں تلوار کی کاٹ پائی جاتی ہے۔ انھوں نے کئی بار سرزنش کی کہ حسین اپنی حد میں رہو اور اپنی زبان قابو میں رکھو لیکن اس حکم کی تعمیل حسین کے بس میں نہیں تھی۔

عمر بن عثمان کے پاس تصوف کی کچھ ایسی کتابیں بھی موجود تھیں جن کی بابت یہ کہا جاتا تھا کہ ان میں تصوف کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کیا گیا ہے۔ حسین ان مسودات کی جستجو میں تھے۔ خود مرشد کو بھی یہ بات معلوم تھی اور وہ اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ ہوشیاری سے کام لیتے تھے۔

حسین کو جب یہ پکا یقین ہو گیا کہ ان گراں مایہ مسودات تک ان کی رسائی ناممکن ہے تو انھوں نے اپنے پیر و مرشد سے درخواست کی: "جنابِ والا! میں چاہتا ہوں کہ ان مسودات کا میں خود بھی مطالعہ کر لوں، براہِ کرم انھیں چند دنوں کے لیے مرحمت فرما دیں۔"

مرشد نے خفگی کا اظہار کیا۔ کہا: "حسین! ابھی تم مبتدی ہو اور اس منزل میں نہیں داخل ہوئے جہاں ان مسودات کا مطالعہ ضروری قرار دیا گیا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ تم پہلے ہماری ضبط و آزمائش پر پورے اترو، اس کے بعد تمھیں یہ مسودات پڑھنے کے لیے دیے جائیں۔"

حسین نے بھی برہمی کا اظہار کیا، بولے: "خیر، اگر آپ مجھے اس کا اہل نہیں سمجھتے تو نہ سمجھیں، میں خود بھی زیادہ اصرار نہیں کروں گا۔"

یکایک عمر بن عثمان نے یہ محسوس کیا کہ حسین کی بے چینی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ وہ سجدے میں گر کے دعا مانگ رہے تھے۔

"اے الہ العالمین! تیرے بندے یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ میں کرتا ہوں، اس میں میرے ارادے شامل ہوتے ہیں لیکن تو عالم الغیب ہے، اور انسانوں کے دلوں کا حال جانتا ہے۔ کیا میں تیرا آلۂ کار نہیں ہوں، کیا تو نے مجھے مجبورِ محض نہیں بنایا، کیا وہ تو نہیں ہے جس نے مجھے ہمیشہ اس بات پر مجبور کیا ہے کہ تو نے میرے دل میں جو باتیں القا کی ہیں انھیں فاش کر دوں، اگر تو ایسا نہیں چاہتا تو مجھے یہ بتا کہ مجھ جیسا کمزور اور مجبور انسان تیری مرضی اور حکم کے خلاف اتنا بڑا قدم کیونکر اُٹھا رہا ہے۔"

عمر بن عثمان نے حسین کو سرزنش کی۔ تنبیہاً کہا: "ابنِ منصور! ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ تم گمراہ ہو چکے ہو۔ تم جو کچھ سوچتے یا کہتے ہو کبھی ان کے نتائج پر بھی غور کیا، تم یقیناً ایک عالم کو خراب کر کے رہو گے لیکن ہمیں یہ بات بھی معلوم ہے کہ اس سے پہلے کہ تم انسانوں کو گمراہ کرو خدا تمھیں کوئی عبرت ناک سزا دے چکا ہو گا۔"

مولانا رومی

نے کسی شریف صورت اور بہترین وضع قطع کے بُرے انسان کو دیکھ کر کہا "اس کی ظاہری وضع قطع پر مت جاؤ کیونکہ یہ اندر سے بُرا ہے!"

کسی نے پوچھا "اسے تو آپ پہچانتے تھے، مطلع فرما دیا لیکن اس جیسے اور بہت سے لوگ ہیں، انھیں کس طرح پہچانا جاتا ہے!"

مولانا نے جواب دیا "معاملات سے، کیونکہ معاملات ہی بہترین کسوٹی ہوتے ہیں جن سے کسی انسان کا کھرا کھوٹا پن سامنے آجاتا ہے ورنہ کتابت میں شیر (درندہ) اور شیر (دُودھ) ایک ہی طرح لکھا جاتا ہے لیکن دونوں کے فوائد اور نقصانات میں زمین آسمان کا فرق ہے!"

حسین کا دل عمر بن عثمان سے بھی اچاٹ ہوگیا۔ یہ اُس سیلاب کے گرد پشتے تعمیر کرنے کی فکر میں تھے جو حسین کے وجود کو ایک تنکے کی طرح اِدھر اُدھر متحرک کیے ہوئے تھا۔ اُس آگ کو بجھا دینے کی کوشش کر رہے تھے جس کی سوزش کے اہلِ طلب ایک عمر متمنّی رہ کر ناکام رہتے ہیں۔ حسین، عمر بن عثمان کا ساتھ بھی چھوڑ دینا چاہتے تھے لیکن وہ یہ ضرور جاننا چاہتے تھے کہ وہ خود جس آتشِ سوزاں میں پھُنک رہے ہیں اور ان کے دل میں جو ایک بھٹی سی سلگ رہی ہے، عمر بن عثمان کی وارداتِ قلبی اور القائے ذاتی سے اس کی کس حد تک تصدیق یا تردید ہوتی ہے کیونکہ ان کے عقیدے اور فکر کے مطابق صداقت اور سچ ہر دشتے ہے یہ جہاں کہیں بھی ہوگی اس کی ایک ہی شکل ہوگی۔ عمر بن عثمان بھی اسی آگ میں جل رہے ہوں گے جس میں حسین ابنِ منصور پھنک رہے تھے پھر کیا وجہ تھی کہ عمر بن عثمان اس اضطراب اور بے چینی کے شکار نہیں تھے جس نے حسین ابنِ منصور کو آتش زیرِ پا کر رکھا تھا؟

یہ سوچ کر حسین ابنِ منصور نے پکا ارادہ کر لیا کہ عمر بن عثمان کا وہ مسودہ ضرور چوری کرنا پڑے گا جس میں تصوّف کا ایک جہان قلبند کر دیا گیا تھا۔ اور عمر بن عثمان اس مسودے کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

عمر بن عثمان تلاوتِ قرآنِ پاک فرما رہے تھے۔ حسین ابنِ منصور ان کے قریب بیٹھے غور سے سُن رہے تھے۔ یکایک ان کے کان میں یہ آواز آئی۔ کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ (میں ایک مخفی خزانہ تھا، میں نے دوست رکھا (یہ ارادہ) کہ پہچانا جاؤں پس میں نے خلق کو پیدا کیا)

حسین ابنِ منصور کی حالت غیر ہوگئی۔ حالتِ وجد میں، بے اختیار کہا "یہ کلام میرا ہے، ایسا کلام میں خود بھی کر سکتا ہوں۔"

عمر بن عثمان قرآنِ پاک کے احترام میں اپنی جگہ سے اُٹھ نہیں سکے لیکن حسین کی بات نے انھیں تڑپا دیا، وہ غصّے میں بے قابو سے ہونے لگے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ تلاوت سے فارغ ہوگئے تو انھوں نے قرآنِ پاک کو جزدان میں رکھا اور اندر سے برہنہ شمشیر لیے نمودار ہوئے۔ ان کے مرید اپنے مرشد کو شمشیر بکف دیکھ کر گھبرا گئے اور حیرانی سے سوال کیا۔ "حضرت! آج ہم آپ کو اس حالت میں کیوں دیکھ رہے ہیں؟ کس کے قتل کا ارادہ ہے؟"

عمر بن عثمان نے غصّے میں کہا "ابنِ منصور کہاں ہے؟ آج ہم اسے قتل کر دیں گے۔"

مرید سناٹے میں آگئے۔ کسی ایک نے جرأت کی، پوچھا "حضرت، ابنِ منصور کی خطا؟"

عمر بن عثمان نے جواب دیا "وہ گمراہ ہو گیا ہے اور اپنی زبان سے کلمات کفر ادا کرنے لگا ہے۔"

حسین ابنِ منصور کا کہیں پتہ نہ تھا۔ عمر بن عثمان کے دُوسرے مرید یہ تو جانتے تھے کہ ابنِ منصور صاف گو اور گستاخ ہیں لیکن انھیں اس وقت یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ابنِ منصور نے کون سے کلمات کفر ادا کیے ہیں جن سے عمر بن عثمان اتنے برہم ہیں۔ حسین ابنِ منصور کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ آخر تھک ہار کے عمر بن عثمان واپس آگئے اور مریدوں سے کہا "اگر میں کسی طرح ابنِ منصور کو پا جاتا تو اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کرنے کی سعادت حاصل کرتا۔"

دُوسری طرف حسین ابنِ منصور وہاں سے رخصت ہو جانے کی کوشش میں تھے لیکن یہ روانگی اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک وہ اپنے پیر و مرشد کا مسوّدہ "گنج نامہ" نہیں حاصل کر لیتے تھے۔ یہ مسودہ جانماز کے نیچے رکھا ہوا تھا اور وہاں تک پہنچنا اور پھر اسے حاصل کرنا بہت دشوار تھا۔ اس سلسلے میں ابنِ منصور نے اپنے ایک سادہ لوح پیر بھائی کا سہارا لیا اور یکایک اس کے سامنے ظاہر ہو کر پوچھا "اس وقت پیر و مرشد کہاں تشریف رکھتے ہیں؟"

سادہ لوح مرید انھیں دیکھتے ہی پریشان ہو گیا، بولا "ابنِ منصور! تم خدا کے لیے یہاں سے کہیں اور چلے جاؤ، پیر و مرشد تمھیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ برہنہ شمشیر ان کے ہاتھ میں ہے اور غصّے میں بار بار یہ فرما رہے ہیں کہ اگر میں کسی طرح ابنِ منصور کو پا جاؤں تو اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کرنے کی سعادت حاصل کروں!" پھر پوچھا "ابنِ منصور! آخر یہ

معاملہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تم گمراہ ہوگئے ہو؟"

ابنِ منصوُر نے افسوس سے جواب دیا۔ "میں کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو عقل و وجدان کے خلاف ہو اور میری یہ خطا نہیں ہے کہ میں غلط باتیں کرتا رہتا ہوں بلکہ خطا یہ ہے کہ میں ان اسرار کو کیوں فاش کر رہا ہوں جنھیں یہ صاحبانِ وجدان و دانش چھپاتے ہیں۔"

مرید نے کہا۔ "اچھا تب پھر تم فوراً میرے مشورے پر عمل کرو اور اسی وقت یہاں سے چلے جاؤ۔"

ابنِ منصوُر نے کہا۔ "میں یہاں سے ایک شرط پر چلا جاؤں گا۔"

مرید نے کہا۔ "بتاؤ وہ شرط کیا ہے؟"

ابنِ منصوُر نے کہا۔ "اچھا تم یہ بتاؤ پیر و مرشد اس وقت کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟"

مُرید نے جواب دیا۔ "ظہر کی نماز کے لیے وضو کر رہے ہیں اور اس وقت غسل خانے میں تشریف رکھتے ہیں۔"

ابنِ منصوُر نے کہا۔ "اچھا، میں آخری بار پیر و مرشد کی جائے نماز کو بوسہ دینا چاہتا ہوں، اس کے بعد یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔"

مرید نے پہرے داری کا فریضہ انجام دیا۔ ابن منصوُر نے جائے نماز کے نیچے سے "گنج نامہ" نکالا اور اپنے پیر و مرشد عمر بن عثمان کا ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔

عمر بن عثمان نے وضو کے دوران داہنے پیر کو دھوتے ہوئے باآوازِ بلند فرمایا۔ "لے گیا، بدبخت لے گیا۔ بہت بُرا کیا، اپنی دُنیا خراب کر لی، زندگی کا سودا کر لیا۔ افسوس افسوس۔"

کسی مرید نے ان ناقابلِ فہم کلمات کی وضاحت چاہی تو آپ نے جواب دیا۔ "وہ ابن منصوُر گستاخ، اس نے یہ بہت بُری حرکت کی کہ ہماری جائے نماز کے نیچے سے گنج نامہ چوری کر لیا، وہ اپنے کیے کی سزا بھگتے گا اور ہمیں یقین کی حد تک یہ ڈر ہے کہ اس نوجوان کے ہاتھ پاؤں اور سر قلم کر دیے جائیں گے۔"

کسی مرید نے غیر معمولی جسارت سے کام لیا۔ کہا۔ "جب آپ اس راز سے واقف ہی ہو گئے تھے کہ ابن منصوُر آپ کا مسودہ گنج نامہ چوری کر کے لیے جا رہا ہے تو آپ مزاحمت کرتے اور اسے اس حرکت سے باز رکھتے۔"

عمر بن عثمان نے جواب دیا۔ "اس نے کلماتِ کفر ادا کیے ہیں، غیر معمولی اسرار فاش کیے ہیں، بے جا جسارتوں اور گستاخیوں کا مرتکب ہوتا جا رہا ہے آخر ان کی کوئی سزا تو ہوگی، اب گنج نامہ چرا لیا ہے یہ سب اس ملنے والی عبرت ناک سزا کی فردِ جرم میں شامل ہیں۔"

ابنِ منصوُر نے بغداد کا رُخ کیا، اب وہ جنید بغدادی کی خدمت میں رہنا چاہتے تھے۔

★

گنج نامہ نظروں کے سامنے تھا۔ ابنِ منصوُر نہایت ذوق و شوق سے اس کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اس میں لکھا تھا۔ "ہم نے تخلیقِ آدم کے بعد جب فرشتوں کو سجدے کا حکم دیا تو ابلیس کے سوا سبھی نے سجدہ کیا، فرشتے تخلیقِ آدم کے بھید سے ناواقف تھے اس لیے بے چون و چرا سجدہ کر لیا۔ ابلیس واقفِ اسرار تھا اس لیے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا پھر ہم نے کہا، زمین کے اندر ہم نے ایک ایسا خزانہ چھپا رکھا ہے کہ جو بھی اس سے واقفیت حاصل کرنا چاہے گا وہ ہلاک ہو گا لیکن ابلیس نے کہا کہ علم و آگہی کا جو خزانہ مجھ کو عطا کیا گیا ہے اس کے بعد کسی اور خزانے کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ میں پھر بھی زمین کے پوشیدہ خزانے کا علم حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ ابلیس کو اجازت اور مہلت دے دی گئی۔"

ابنِ منصوُر نے زیرِلب مسکرا کے کہا۔ "خوب! گنج نامہ عمر بن عثمان ایک انسان کی تصنیف ہے اور اس کا لہجہ یہ بتاتا ہے گویا کوئی انسان نہیں، خود خدا مخاطب ہے، اور جب یہی بات میں اپنی زبان سے کہتا ہوں تو مجھے کافر و زندیق گردانا جاتا ہے۔ میں اتنی منافقت تو نہیں کر سکتا کہ دل میں کچھ اور ہو اور زبان پر کچھ اور۔"

یہ جنیدِ بغدادی کی خدمت میں پہنچے اور ادب سے ہاتھ باندھ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔

جنیدِ بغدادی نے سوال کیا۔ "ابنِ منصوُر! تم ہمارے پاس کس لیے آئے ہو؟"

ابنِ منصوُر نے جواب دیا۔ "شیخ کی صحبت اختیار کرنے کی غرض سے۔"

جنیدِ بغدادی نے بے رُخی سے جواب دیا۔ "ابنِ منصوُر! افسوس کہ ہم دیوانوں کو اپنی صحبت میں نہیں رکھتے، تم کوئی اور در دیکھو۔"

ابنِ منصوُر نے مایوسی سے کہا۔ "آخر یہ کیوں؟ اس در سے کسی کو کبھی بھی مایوس نہیں کیا گیا، پھر مجھے کیوں مایوس رکھا جائے گا۔"

جنیدِ بغدادی نے جواب دیا۔ "ابنِ منصوُر! حسنِ صحبت کا یہ تقاضا ہے کہ انسان کسی حد تک اپنے ہوش و حواس میں ہو، اگر آدمی میں ہوش و حواس نہ ہوں تو اس کا طرزِ عمل بالکل معاندانہ ہو گا تمھارے جیسا، تم نے سہل بن عبداللہ کی صحبت چھوڑی، عمر بن عثمان کی صحبت میں رہنے

لگے اور اب ان سے جُدا ہو کر ہمارے پاس چلے آئے، ایسے متلوّن مزاج انسان کا کیا بھروسا ہے؟ کل ہمارا ساتھ چھوڑ کے کسی اور کے پاس چلے جاؤ گے۔"

ابنِ منصُور نے جواب دیا۔ "ہوش ہو یا مدہوشی، دونوں ہی انسانی صفات ہیں اور میں خدا سے دُعا مانگتا رہتا ہوں کہ وہ مجھے سُرخرو کرے۔ شیخ! ایک بات آپ بھی جان لیں کہ جب تک کوئی انسان اپنی صفات بالکل نیست و نابود نہ کر دے، وہ اپنے مالک سے نہاں اور مستور ہی رہتا ہے۔"

جنید بغدادی نے ذرا طیش میں کہا۔ "ابنِ منصُور! ہوش اور مدہوشی کے معاملے میں تم غلطی پر ہو اور تمھیں شاید یہ نہیں معلوم کہ ہوش اور مدہوشی انسان کی اختیاری حالت نہیں ہیں۔ انھیں محض اپنی کوشش سے نہیں حاصل کیا جا سکتا۔ ابنِ منصُور! ذرا ہوش و حواس سے کام لو، کیونکہ تمھارے اقوال اور فکر میں یا تو دیوانگی کا وافر حصّہ ملتا ہے یا پھر حماقت کا۔"

ابنِ منصُور نے جنید بغدادی سے زیادہ بحث نہیں کی، خاموشی اختیار کی اور خلوت و سکوت کی تربیت سے آراستہ ہونے کے بعد یہ حج کی غرض سے مکہ معظمہ چلے گئے۔ حج سے پھر بغداد واپس آ گئے اور جنید بغدادی کی خدمت میں رہنے لگے۔ اسی دوران انھوں نے شادی بھی کر لی تھی۔

ایک دن جنید بغدادی سے سوال کیا۔ "حضرت! مجھ سے سرزد ہونے والے افعال کا ذمّے دار کون ہے؟"

جنید بغدادی نے جواب دیا۔ "تم خود۔"

ابنِ منصُور نے کہا۔ "لیکن جناب، مجھے اس سے اختلاف ہے، اپنے سارے اعمال اور افعال کا ذمّے دار میں کیوں ٹھیرایا جاؤں، میں معلّم الملکوت نہیں ہوں کہ انکارِ سجدہ کا گناہ اپنی گردن پر رکھ لوں، میں جو کچھ کرتا ہوں یا آیندہ کروں گا وہ میرا فعل نہیں ہوگا بلکہ وہ من جانب اللہ ہوگا اور یہ ایک ایسا راز ہے جسے میں چھپا نہیں سکتا، چھپانا بھی چاہوں تو بھی نہ چھپا سکوں۔"

جنید بغدادی، ابنِ منصُور کی باتیں نہایت غور سے سنتے رہے پھر فرمایا۔ "ابنِ منصُور! ہماری پیش گوئی اپنی گرہ میں باندھ لے، تُو اپنی عُمر کے کسی نہ کسی حصّے میں لکڑی کا سر سُرخ کرے گا، ہماری یہ بات ہمیشہ ذہن اور حافظے میں محفوظ رکھ!"

ابنِ منصُور نے جواب دیا۔ "اپنے انجام سے میں خود بھی واقف ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جب میری بابت سُولی دیے جانے کا حکم دیا جانے لگے گا تو خلیفۂ وقت کی طرف سے آپ کو حکم ملے گا کہ ابنِ منصُور کے معاملے میں اپنے فیصلے سے مطلع کرو، اس وقت آپ مجبوراً علمائے ظاہر کا لباس پہن کر میرے خلاف فتویٰ صادر فرمائیں گے۔"

جنید بغدادی نے ایک دم خاموشی اختیار کر لی۔

چند دوست آپس میں مختلف موضوعات پر بات چیت کر رہے تھے۔ گفتگو کہیں سے کہیں پہنچ گئی اور بات یہاں تک پہنچی کہ دُنیا کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی باتیں زیرِ بحث آنے لگیں۔

اسی سلسلے میں ایک دوست نے سوال کیا۔ "دُنیا کا آسان ترین کام کیا ہے اور مشکل ترین کام کیا ہے؟"

بیوی کے ظلم و ستم جھیلا ہوا ایک دوست بولا۔ "آسان ترین کام ہے شادی کرنا اور مشکل ترین کام ہے شادی کر کے نبھا دینا۔"

جنید بغدادی سے بھی نہ نبھ سکی اور یہ ناراض ہو کر تستر چلے گئے۔ یہاں ان کے گرد عقیدت مندوں کا ایک مجمع رہنے لگا۔ طبیعت کی بے باکی اور صاف گوئی کی وجہ سے اہلِ ظاہر آپ سے ناراض رہتے اور حسد کرتے۔ یہ بھی ان کی کوئی پروا نہ کرتے۔ عمر بن عثمان نے بھی معاندانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ حسین ابنِ منصُور تستر میں مقیم ہیں تو انھوں نے ان کے خلاف، اپنے خطوط کے ذریعے لوگوں کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ ابنِ منصُور کو اپنے مرشد کی اس روش سے بڑی اذیت پہنچی۔ ایک طرف علمائے ظاہر کی معاندانہ روش اور حسد، دوسری طرف عمر بن عثمان کے مخالفانہ خطوط کی یلغار، ابنِ منصُور اتنے عاجز آ گئے کہ دنیا داروں جیسی روش اختیار کر لی لیکن اس پر زیادہ دن نہیں چل سکے۔ اس عرصے میں یہ کتابیں بھی تصنیف کرتے رہے۔ ان بلند پایہ تصانیف پر انھیں حلاج الاسرار کا خطاب دیا گیا۔

اس کے بعد ابنِ منصُور نے سیاحت شروع کر دی، جہاں جاتے وہاں کے لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے۔ اہواز کے راستے برصغیر میں داخل ہوئے اور یہاں سے خراسان ہوتے ہوئے ماوراء النہر پہنچے اور ماوراء النہر سے مغربی چین چلے گئے جہاں بھی گئے وہاں کے لوگوں نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔

آپ عبادت و ریاضت میں سخت محنت سے کام لیتے اور بڑی اذیتیں برداشت کرتے۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ "جب آپ عظمت اور بزرگی کے اتنے بڑے منصب پر فائز ہیں تو اتنی مشقت اور اذیت کیوں جھیلتے ہیں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "عشق اور دوستی کا مفہوم ہی یہی ہے کہ مصائب پر صبر کیا جائے اور اس راہ میں جو فنا ہو جاتے ہیں، انھیں خوشی

اور غم کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔"

اس زمانے میں آپ ایک ہی گدڑی میں زندگی بسر کر رہے تھے۔

ایک عرصے بعد آپ کے عقیدت مندوں نے مجبور کیا کہ وہ اس پھٹی پرانی بوسیدہ گدڑی کو علیحدہ کر دیں۔ یہ اس پر مُصر تھے کہ "میں اس گدڑی کو نہیں چھوڑوں گا۔" عقیدت مندوں نے ازراہِ عقیدت جبراً یہ گدڑی ان سے چھین لی، اس چھین جھپٹ میں گدڑی کے اندر سے ایک بچھو زمین پر گر کر رینگنے لگا۔ کسی عقیدت مند نے اسے مارنے کے لیے پتھر اٹھایا تو ابنِ منصور نہایت کرب سے آگے بڑھے اور اس شخص کے ہاتھ سے پتھر چھین لیا اور اسے ایک طرف پھینکتے ہوئے فرمایا۔ "اسے مت مارو کیونکہ یہ بارہ برس سے اس گدڑی میں فرضِ رفاقت ادا کر رہا ہے۔"

اس بار آپ نے اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ حج کا ارادہ کیا۔

آپ نے اپنے عقیدت مندوں کے ہجوم کے ساتھ حج کا سفر کیا۔ سفر طویل تھا اور زادِ راہ قلیل۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لوگ بھوک سے پریشان ہونے لگے۔ ابنِ منصور نے بے نیازی اختیار کی تو لوگوں نے شکوہ کیا کہ "حضرت، آپ کے ساتھ سفر کیا اور بھوک کے شکار ہوئے۔ کچھ کھائے بغیر یہ سفر کیوں کر کٹے گا؟"

آپ نے پوچھا۔ "تم لوگ کیا کھانا چاہتے ہو؟"

کہاں تو خوراک نام کا ایک ذرّہ بھی کسی کے پاس نہ تھا اور کہاں ابنِ منصور کا یہ سوال کہ "تم لوگ کیا کھانا چاہتے ہو؟"

کسی عقیدت مند نے جواب دیا۔ "حضرت، اس وقت جو بھی مل جائے غنیمت ہے۔"

ابنِ منصور نے پھر سوال کیا۔ "تمھیں خواہش کس چیز کی ہے؟"

عقیدت مند نے جواب دیا۔ "سِری اور روٹیاں۔"

آپ نے انھیں حکم دیا۔ "تم لوگ اپنی اپنی چادریں بچھا کر ایک صف میں بیٹھ جاؤ۔"

لوگوں نے حکم کی تعمیل کر دی۔ ابنِ منصور صف کے ایک کنارے کھڑے ہو گئے اور دونوں ہاتھ پشت پر لے گئے اور فوراً ہی واپس لے آئے۔ اس وقت ان کے دونوں ہاتھوں میں ایک بھنی ہوئی سِری اور دو گرم گرم روٹیاں موجود تھیں۔ آپ نے صف کے پہلے شخص کے سامنے دونوں چیزیں رکھ دیں اور کہا۔ "ذرا صبر سے کام لو، جب یہی چیزیں بقیہ دوسروں کے سامنے بھی رکھ دی جائیں تو سب ایک ساتھ کھانا۔"

پھر عقیدت مندوں نے یہ دلچسپ تماشا دیکھا کہ ابنِ منصور کے ہاتھ بار بار پیچھے جاتے اور جب سامنے آتے تو ایک سِری اور دو گرم گرم روٹیاں ہاتھوں میں موجود ہوتیں۔ جب یہ عمل تکمیل کو پہنچا تو آپ نے انھیں حکم دیا۔ "اچھا بسم اللہ!"

لوگوں نے کھانا شروع کر دیا اور خوب شکم سیر ہو کر دم لیا۔

لوگوں کے لیے یہ ایک دلچسپ کرامت تھی۔ وہ ابنِ منصور کی موجودگی میں احتیاجاتِ زندگی کی طرف سے بے نیاز ہو گئے۔ اس سفر میں ایک جگہ کچھ دیر کے لیے قیام کیا تو عقیدت مندوں نے خواہش کی کہ وہ خرمے کھانا چاہتے ہیں۔

آپ نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو دُور دُور تک خرمے کا کوئی درخت بھی نظر نہ آیا۔ آپ نے کہا۔ "خرمے کس طرح کھاؤ گے؟ نہ تو یہاں کوئی بازار ہے کہ خرمے خرید کر کھلائے جائیں، نہ خرمے کے درخت ہیں کہ انھیں توڑ لیا جائے۔"

عقیدت مندوں نے اصرار کیا۔ "ہم تو آپ کے سامنے اپنی احتیاج عرض کر کے خاموش ہو رہیں گے، وہ مطلوبہ شے کہاں سے اور کس طرح حاصل ہو گی، ہم مجبور اور گناہ گار لوگ اس پر غور نہیں کرنا چاہتے۔"

آپ تن کر کھڑے ہو گئے اور لوگوں سے فرمایا۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ مجھ سے کتنی عقیدت رکھتے ہو لیکن تم میں سے اکثر ان تماشائیوں اور لعن طعن کرنے والوں میں شامل ہوں گے جو مجھے کافر قرار دیں گے۔"

لوگوں نے بیک آواز کہا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا کبھی بھی نہیں ہو گا۔"

ابنِ منصور نے کہا۔ "اچھا پھر تم لوگ باری باری میرے جسم کو اس طرح ہلاؤ جس طرح پھل والے درخت کو ہلایا جاتا ہے۔"

کئی آدمیوں نے باری باری آپ کو شانوں سے پکڑ کر ہلایا اور ہر بار جسم کے مختلف حصوں سے خرمے یوں گرنے لگے جس طرح درختوں سے گرتے ہیں۔ کچھ دیر بعد اتنے خرمے جمع ہو گئے کہ سبھوں کا اچھی طرح بھلا ہو گیا۔

ابھی یہ لوگ بغداد سے کافی دُور تھے۔ خرموں کے بعد کسی نے خواہش کی کہ "میں حلوہ کھانا چاہتا ہوں۔"

آپ نے قدرے توقف کے بعد حلوے کا طباق بھی ان کے سامنے رکھ دیا۔ لوگوں نے مزے لے لے کر حلوہ کھایا اور بیک زبان عرض کیا۔ "جناب! ایسا حلوہ تو بغداد کے سوا کہیں بھی نہ ملے گا، مزہ آ گیا۔"

ابنِ منصور خاموش رہے۔ رات کو جب لوگ آرام کر رہے تھے۔ ابنِ منصور نہایت دردناک آواز میں اپنے اشعار پڑھ رہے تھے۔ اس الحاح و زاری سے کئی کی نیندیں اُڑ گئیں اور وہ چھپ چھپ کر ابنِ منصور کا کلام سننے لگے۔ ابنِ منصور خدا سے مخاطب تھے اور کہہ رہے تھے۔

"ہم دو روحیں ہیں جنھوں نے ایک بدن کی صورت اختیار کر لی ہے۔

جب وہ مجھے دیکھتا ہے، میں اسے دیکھتا ہوں۔
جب میں اسے دیکھتا ہوں، وہ مجھے دیکھتا ہے۔
تو میرے رگ و پے اور قلب میں جاری و ساری ہے۔
بالکل اس طرح جس طرح آنسو میری آنکھوں سے جاری ہیں۔
ضمیر، قلب میں اس طرح حل ہو گیا ہے۔
جس طرح روح بدن میں جذب ہو جاتی ہے۔
اے اللہ! تیری روح میری روح میں اس طرح سما گئی ہے جس طرح آبِ زلال میں شراب۔
جب کوئی چیز تجھے مس ہوتی ہے تو مجھے بھی مس ہوتی ہے۔
کیونکہ تو اور میں ہر حال میں ایک ہیں۔"

چھپ چھپ کر سننے والوں میں سے بعض نے کہا۔ "ارے یہ تو بہک رہا ہے اور کفر بک رہا ہے۔" لیکن کسی اور نے تردید کی۔ جواب دیا۔ "نہیں، ابنِ منصور کافر نہیں ہو سکتے۔ یہ مقامِ وصلت میں ہیں جہاں دُوئی کا جھگڑا مٹ جاتا ہے اور پھر کافر اور ملحد قرار دینا فقہا کا منصب ہے، ہم ایسی باتیں کیوں کریں۔"

ان آپس کے بحث مباحثوں میں کوئی ایک فریق بھی اپنے مخالف کو ہم خیال نہ بنا سکا اور وہ دو حصوں میں بٹ گئے۔ جب یہ لوگ بغداد کے باب الطاق میں داخل ہوئے اور کھانا خریدنے بازار میں پہنچے تو ان میں سے کسی ایک کے پاس وہ طباق بھی تھا جس میں انھیں ابنِ منصور نے گرما گرم حلوہ پیش کیا تھا۔ ایک حلوائی اس طباق کو غور سے دیکھ رہا تھا، پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور طباق والے شخص کو پکڑ لیا اور پوچھا۔
"یہ طباق میرا ہے، تمھیں کہاں سے ملا؟"

یہ شخص گھبرا گیا۔ بولا۔ "تیرا ہی ہوگا، مجھے کیا پتہ؟" پھر اس نے ابنِ منصور کا واقعہ سناتے ہوئے کہا۔ "ہمیں تو یہ ان سے ملا تھا۔ یہ انھیں کس نے دیا اور ان کے پاس کس طرح پہنچا، انھی سے جا کر معلوم کر لو، ہم کیا جواب دے سکتے ہیں؟"

حلوائی نے کہا۔ "تم مجھے ابنِ منصور کے پاس لے چلو۔ میں اس عجیب و غریب شخص سے ملنا چاہتا ہوں۔"

حلوائی کو ابنِ منصور کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ لوگوں کا خیال تھا یہ حلوائی ابنِ منصور سے اُلجھ جائے گا اور جھگڑا کرے گا لیکن وہ ابنِ منصور کے قدموں میں گر گیا اور رو رو کر عرض کیا۔ "حضرت! اس ناچیز کو بھی اپنی ہم رکابی کا شرف عطا فرمائیں، ایسے برگزیدہ اور خدا رسیدہ لوگ آج کل ملتے کہاں ہیں۔"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔ "کیا تم خود کو اللہ کی راہ میں فنا کرنے کا عزم رکھتے ہو؟"

"بالکل، میں تو ہر اس بات کے لیے آمادہ و تیار ہوں جس کا آپ حکم فرمائیں گے۔"

ابنِ منصور نے پوچھا۔ "اپنے اہل و عیال کا کیا بندوبست کیا؟"

حلوائی نے جواب دیا۔ "انھیں خدا کے سپرد کیا۔"

"خوب!" ابنِ منصور نے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو بسم اللہ۔"

حلوائی اسی وقت سے آپ کے ساتھ رہنے لگا۔

بغداد میں ابنِ منصور کے خلاف چرچے شروع ہو گئے۔ علمائے ظاہر انھیں گھیر کر بیٹھ گئے اور زچ کر دینے والے سوالات کرنے لگے۔ جنید بغدادی نے ناراضی کا اظہار کیا، جب لوگوں نے ان سے ابنِ منصور کا ذکر کیا اور یہ بتایا کہ شہر کے علما اور فقیہ ان پر سوالات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کر رہے ہیں تو آپ نے افسوس اور دکھ سے منہ پھیر لیا اور فرمایا۔ "ابنِ منصور اپنا دشمن آپ ہے، ہم کیا کر سکتے ہیں؟ آخر یہ کہاں کی عقل مندی ہے کہ جن پر ابتدائے آفرینش سے پردہ پڑا ہوا ہے تم ان اسرار سے پردہ اٹھا دو اور جو کوئی ایسا کرے گا اس کی سزا بھی بھگتے گا۔"

حاسد اور نادان علما نے ابنِ منصور کو طرح طرح کے سوالوں سے ہلکان کر دیا۔ کسی عالم نے سوال کیا۔ "جنابِ والا! ذرا یہ تو بتائیے کہ حضرت موسیٰؑ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔ "وہ پیغمبر تھے، پیغمبرِ حق یعنی برحق۔"

اس عالم نے دوسرا سوال کیا۔ "اور فرعون کی بابت کیا خیال ہے؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "وہ بھی سچا تھا۔"

طنز و استہزا کا پُرشور قہقہہ بلند ہوا۔ "خوب، موسیٰ بھی حق پر تھے اور فرعون بھی حق پر۔ یہ کیا بات ہوئی؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔ "تم لوگ ہنستے کیوں ہو؟ کیا تم اتنی بات بھی نہیں جانتے کہ خدا نے دو طرح کے لوگ پیدا فرمائے ہیں، ایک عام اور دوسرے خاص ـــ اور یہ دونوں ہی قسم کے لوگ اپنے حصے کا کام انجام دیتے رہتے ہیں۔"

کسی شخص نے تند و تیز لہجے میں کہا۔ "یہ تو کیا بک رہا ہے؟"

ابنِ منصور نے تحمل سے جواب دیا۔ "پہلے پوری بات سن لو، ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ خدا نے دو طرح کے انسان پیدا فرمائے ہیں۔ عام اور خاص ـــ اور دونوں ہی کے ذمے جو کام لگائے گئے ہیں، یہ انھیں انجام دیتے رہتے ہیں۔ دونوں کو راستہ دکھانے والا خدا

ہے۔ حکمت ایک تیر ہے، خدا تیر انداز اور مخلوق اس کا نشانہ۔ خدا اور اس کی یاد میں دُنیا اور آخرت بھُلا دینے والا واصل الی اللہ ہوتا ہے اور فقر یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا کی عبادت میں ہر شئے سے مستغنی ہو جائے۔"

لوگ ان کی باتوں سے سخت برہم و بیزار تھے۔ کسی نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "ابنِ منصور! تم وہی ہو نا جسے لوگ حلاج کہتے ہیں کیا خدا تم جیسے معمولی خاندان کے حقیر انسان پر اپنی ذات منکشف کر سکے گا؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔ "تم لوگ کیسی جہالت کی باتیں کر رہے ہو، ذاتِ خداوندی جس پر منکشف ہونا چاہتی ہے تو وہ ادنا اعلا نہیں دیکھتی۔ وہ ادنا شئے قبول کر کے منکشف ہو جاتی ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اعمالِ صالحہ بھی قبول نہیں کرتی۔"

ایک شخص نے سوال کیا۔ "صبر کیا ہے؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔ "صبر کا مفہوم یہ ہے کہ اگر صبر کرنے والے کے ہاتھ پیر کاٹ کر سولی پر چڑھا دیا جائے تو وہ اُف نہ کرے۔ شکایت کرنے والا صابر نہیں کہلائے گا۔"

کسی شخص نے آہستہ سے کہا۔ "مت گھبراؤ ابنِ منصور! تمھیں بھی صبر کی اس کسوٹی پر کس کر دیکھ لیا جائے گا۔"

کسی عالم نے سوال کیا۔ "آخر انبیائے کرام بہکتے کیوں نہیں؟"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔ "انبیائے کرام اعمال پر غالب رہتے ہیں، اسی وجہ سے اعمال انھیں گردش دینے میں بے بس رہتے تھے اور انبیائے کرام خود اعمال کو گردش دیا کرتے تھے۔"

لوگوں نے جدا ہونے سے پہلے انھیں تنبیہہ کی۔ "ابنِ منصور! اگر تم یہ چاہتے ہو کہ کچھ دن اور زندہ رہو تو اپنے افکار اور خیالات کے اظہار میں ہوش مندی اور میانہ روی سے کام لو، ورنہ فی الحال تو ایسا نظر آتا ہے کہ تم کافر قرار دیے جاؤ اور اس جرم کی جو سزا تمھیں مل سکتی ہے فقیہانِ شہر سے معلوم کر لینا۔"

ابنِ منصور نے خندہ پیشانی سے جواب دیا۔ "جو کچھ میں کہتا ہوں، میں خود نہیں کہتا بلکہ خدا کہتا ہے، میری زبان سے خدا خود کلام فرماتا ہے، آخر یہ بات تم لوگ کیوں نہیں سمجھتے۔"

کسی نرم دل عالم نے ازراہِ ہمدردی کہا۔ "ارحم الرّاحمین تم پر رحم فرمائے ابنِ منصور!"

ابنِ منصور نے جواب دیا۔ "ارحم الرّاحمین خود میری ذات میں موجود ہے، کیا وہ خود اپنی ذات پر رحم فرما سکتا ہے؟ تم فقیہانِ شہر اور علمائے ظاہر ان باطنی اور حقیقی رموز کو کیا سمجھو، اب جاؤ اور مجھے زیادہ پریشان نہ کرو۔"

لوگوں نے ان پر لعن طعن شروع کر دی اور کنکر پتھر برسانے لگے۔ وہ بیک آواز چیخ رہے تھے۔ "دیوانہ ہے دیوانہ، کافر ہے مشرک ہے، اسے مارو، سنگسار کر دو، یہاں تک کہ مر جائے۔"

لیکن کسی فقیہہ نے انھیں ایسا کرنے سے روکا۔ کہا۔ "لوگو! تم قانون کو اپنے ہاتھ میں کیوں لیتے ہو ہم اسے فقہائے عصر اور علمائے عہد کے رُوبرو پیش کیا جائے اور پھر شرع جیسا حکم دے گی اس پر عمل کیا جائے گا۔"

لوگ وہاں سے ہٹ گئے اور ابنِ منصور نے بغداد چھوڑ دیا۔ حج کے لیے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے۔

حسین ابنِ منصور نے اپنے چار ہزار ہمراہیوں کے ساتھ حج کیا لیکن انھیں لوگوں سے جیسی اذیتیں پہنچ رہی تھیں اس کا بڑا اثر تھا انھیں اس ہجوم میں اکثر کی منافقت پر غصہ بھی تھا اور افسوس بھی۔ وہ لوگ جو ابنِ منصور کو سمجھ نہیں سکتے انھیں کافر کیوں قرار دیتے ہیں۔ اس بات پر وہ بہت برہم تھے۔ انھوں نے میدانِ عرفات میں ہزاروں آدمیوں کے سامنے باآوازِ بلند دُعا مانگی۔ "اے اللہ! تو سرگرداں لوگوں کو راہ دکھانے والا ہے۔ اگر میں تیرے نزدیک بھی کافر ہوں تو میرے کفر میں اضافہ فرما دے۔"

لوگ توبہ استغفار کرتے ہوئے ان سے علیحدہ ہو گئے کیونکہ اب ان سب کو یقین ہو چکا تھا کہ ابنِ منصور مسلمان نہیں رہے، کافر ہو چکے ہیں۔ ابنِ منصور نے تنہائی میں خدا کے سامنے گریہ وزاری کی۔ روتے ہوئے دِل جلے لہجے میں کہا۔ "اے خدا! تو دلوں کے بھید جانتا ہے۔ تجھے معلوم ہے کہ میں تجھے واحد سمجھتا ہوں اور تیری ہی عبادت کرتا ہوں، کسی اور کی عبادت نہیں کرتا، اپنے عجز کی وجہ سے تیرے انعامات کا شکریہ بھی نہیں ادا کر سکتا لہٰذا اگر تو میری خواہش جاننا چاہتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اپنا شکر تو خود ادا کر لے اس لیے کہ بندوں سے تیرا شکر کسی طرح بھی ادا نہیں ہو سکتا۔"

اب ابنِ منصور کے افکار اور اعمال میں زیادہ شدت پیدا ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور مریدوں کو جو خطوط لکھے، ان کا لب و لہجہ انتہائی آزادانہ اور ہوش رُبا ہوتا تھا۔ آپ نے ایک مرید کو خط لکھا۔

" مِن جانب ارحم الرّاحمین، بنام بندۂ خدا — تم نے پوچھا تھا کہ ابلیس نے آدم کو سجدہ کیوں نہیں کیا۔ ہر چند کہ یہ راز ایسا نہیں تھا جسے چھپایا جاتا لیکن لوگوں نے چھپایا۔ اس کا جواب میں دیتا ہوں ابلیس بہت بڑا موحد تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنے

رب کا بھی وہ حکم نہیں مانا جس میں شرک کی بُو پائی جاتی تھی۔"

اس نوع کے خطوط خلیفہ کے ملاحظے میں بھیج دیے گئے اور اس سے درخواست کی گئی کہ "ابنِ منصُور جیسی باتیں کر رہا ہے اس سے ایک عالَم گمراہ ہو جائے گا اور فتنوں کا ایسا در کھلے گا کہ اسے بند کرنا ناممکن ہو جائے گا۔"

قمری سن کے اعتبار سے ۵۳ سال کی عمر میں (۲۹۷ھ) ابنِ داؤد اصفہانی کے فتوے کی بنیاد پر ابنِ منصُور گرفتار کر لیے گئے لیکن ایک سال بعد قید خانے سے فرار ہو کر سوس چلے گئے اور وہاں پوشیدہ طور پر رہنے لگے لیکن کب تک خاموش رہتے؟ یہاں سے انھوں نے جو خطوط لکھے وہ بھی بڑے تند و تیز تھے۔ اب انھوں نے "انا الحق" کا نعرہ لگایا۔

'انا الحق' یعنی 'میں ہی وجودِ خداوندی ہوں'۔ یہ ایسا نعرہ تھا جس نے دُور دُور تک زلزلہ برپا کر دیا۔ بڑے بڑے کانپ گئے۔ ذی فہم اور واقفِ اسرار کسی متوقع ہنگامے کی فکر میں گُنگ ہو گئے نادان اور نااہل مشتعل ہو گئے اور ابنِ منصُور پر سنگ باری کرنے لگے۔

انھوں نے ایک بار پھر اپنے مریدوں کو جو خطوط لکھے اور ان میں جن افکار اور خیالات کا اظہار فرمایا وہ علما اور فقہا کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ انھوں نے لکھا۔

"من جانب الرحمٰن الرحیم بنام بندۂ خُدا۔ تم نے ادیانِ عالم کی بابت جاننا چاہا ہے تو لو سنو اور غور کرو، تمام دین حقیقت میں ایک ہیں ان کا اختلاف فروعات میں ہے۔ تمام ادیان کا مرکز اور منبع خدا ہے اور یہ دین خدا کے لیے ہیں، ہر دین سے کوئی نہ کوئی گروہ وابستہ ہے اور یہ وابستگی انسانوں کی اپنی مرضی سے نہیں ہے بلکہ اس میں کسی بالادست قوت کی مرضی کارفرما ہے۔ وہ صرف اللہ ہے جو اپنے بندوں پر اپنی مشیت نافذ کرتا ہے اور یہ صرف خدا ہے جو اپنے بندوں کے بارے میں یہ فیصلے کرتا ہے کہ فلاں شخص یہودی ہو، فلاں عیسائی بنے اور فلاں کسی مسلمان کے گھر میں پیدا ہو۔ لہٰذا اس سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ یہ کہ کسی کو کسی کے دین پر معترض نہیں ہونا چاہیے اور نہ دین کے اختلاف پر کسی سے نفرت کرنی چاہیے۔ سارے دین خدا کے لیے ہیں اور جو شخص جو دین بھی اختیار کرتا ہے وہ حقیقتہً خدا کی مشیت پوری کرتا ہے۔"

سنہ ۳۰۱ھ میں وہ دوبارہ گرفتار کر لیے گئے اور انھیں بغداد کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ بغداد اور اس کے آس پاس دُور دُور تک ابنِ منصُور کی گرفتاری کی خبر پھیل گئی اور لوگ قید خانے میں ملاقات کے لیے پہنچنے لگے۔ انھی میں جنید بغدادی کے مشہور مُرید اور صاحبِ حال بزرگ ابو بکر شبلی بھی شامل تھے۔ شبلی بھی کچھ کم بے باک نہیں تھے۔ ان کا انداز بھی نہایت جارحانہ رہتا تھا۔ شبلی نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ ابنِ منصُور کو اس کے جرم میں وہ خود قتل کر دیں۔ جب یہ اس نیت سے قید خانے میں داخل ہوئے تو ابنِ منصُور نے دیکھتے ہی سوال کیا۔ "شبلی! کیا تم مجھے واقعی قتل کر دینا چاہتے ہو؟"

شبلی نے جواب دیا۔ "تیرا جرم ناقابلِ معافی ہے۔"

ابنِ منصُور نے حیرت اور افسوس سے کہا۔ "شبلی! تم بھی مجھے مجرم کہہ رہے ہو اور میرے مسلک کو جرم قرار دے رہے ہو؟"

شبلی نے جواب دیا۔ "تو نے اسرارِ خداوندی کو عامیوں پر کھول دیا ہے۔ تجھے ضبط اور احتیاط سے کام کرنا تھا۔"

ابنِ منصُور نے افسوس سے کہا۔ "جب تک میں برداشت کر سکا برابر برداشت کرتا رہا لیکن اب معاملہ ضبط اور احتیاط کی دسترس سے نکل چکا تھا۔"

شبلی نے کہا۔ "پھر بھی تمھیں 'انا الحق' اور 'من جانب الرحمٰن الرحیم' جیسے کلمات سے بچنا چاہیے تھا۔"

ابنِ منصُور نے پوچھا۔ "کیا یہ واقعی اتنے بڑے جرم ہیں کہ مجھے معاف نہیں کیا جا سکتا۔"

شبلی نے جواب دیا۔ "یہ بات فقیہانِ شہر ہی سمجھ سکتے ہیں یعنی وہ چاہیں تو معاف کر دیں اور نہ چاہیں تو مقدمہ چلاتے رہیں۔"

ابنِ منصُور نے کہا۔ "شبلی! ایک بات میری بھی سُن لو، تم دیکھ رہے ہو کہ مجھ پر دیوانگی طاری ہو چکی ہے اور میں خود ہی اپنی موت کو دعوت دے رہا ہوں۔ ان حالات میں مجھے تم قتل نہ کرو، یہ گناہ کسی اور کو کرنے دو۔"

لوگوں نے جنید بغدادی سے دریافت کیا۔ "حضرت! حسین ابنِ منصُور جو کچھ کہتے ہیں اس میں کوئی تاویل ممکن ہے یا نہیں کیونکہ اس کے بغیر وہ رہا نہیں کیے جائیں گے اور انھیں قتل کر دیا جائے گا۔"

جنید بغدادی نے جواب دیا۔ "اب تم لوگ خاموش ہو جاؤ کیونکہ تاویل کا وقت نکل چکا ہے، جو ہو رہا ہے اسے ہو جانے دو۔" ان لوگوں نے قید خانے میں ابنِ منصُور سے ملاقات کی اور کہا۔

"ابنِ منصُور! خلیفۂ وقت تم سے بہت ناراض ہیں لیکن اب بھی اتنا وقت باقی ہے کہ اگر تم انا الحق نہ کہو اور اپنے خطوط کا لب و لہجہ بدل دو تو تمھیں رہا کرایا جا سکتا ہے۔"

ابنِ منصُور نے جواب دیا۔ "میں مجبور ہوں، تم اپنا کام کرو میں اپنا کام انجام دے رہا ہوں کیونکہ ہم دونوں اپنے اپنے ذمے سونپی ہوئی خدمات انجام دینے پر مجبور ہیں۔"

چند عقیدت مند ان سے رات میں ملنے گئے لیکن ابنِ منصُور قید خانے میں موجود نہ تھے۔ پہرے دار گھبرا گئے اور پوری رات تلاش

اور جستجو میں گزار دی لیکن صبح یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ابنِ منصوُر اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ دُوسری شب اِس سے بھی زیادہ عجیب واقعہ پیش آیا۔ ابنِ منصوُر کے معتقد پوُری رات قیدخانہ تلاش کرتے رہے۔ نہ قیدخانہ مِلا' نہ ابنِ منصوُر سے ملاقات ہوئی لیکن تیسری شب دونوں ہی مل گئے۔ ابنِ منصوُر بھی اور قیدخانہ بھی۔ لوگوں نے ابنِ منصوُر سے اس کا سبب دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا "ہاں' پہلی شب میں قیدخانے میں موجود نہیں تھا، رسُول اللہؐ کی خدمت میں چلا گیا تھا"

کسی معتقد نے پوچھا "اور دُوسری شب ــــ؟ ہم ساری رات قیدخانہ تلاش کرتے رہے لیکن یہ نظروں سے اوجھل ہی رہا' آخر یہ کیا تھا؟"

ابنِ منصوُر نے جواب دیا "ہاں' دوسری شب رسُول اللہؐ خود تشریف لے آئے تھے اس لیے آپ کی موجودگی میں قیدخانہ اپنی حیثیت کھو بیٹھا تھا"

کسی مرید نے کہا "اگر آپ چاہیں تو یہاں سے فرار ہو سکتے ہیں"

"ہاں" ابنِ منصوُر نے کہا "لیکن میں تحفظِ شریعت کی خاطر یہاں رہنے پر مجبُور ہوں"

قیدخانے میں پوری پوری رات نماز میں گزر جاتی تھی۔ کسی نے ازراہِ مذاق سوال کیا "جب آپ نے 'انا الحق' کا نعرہ بلند کر دیا ہے یعنی وجودِ خداوندی آپ خود ہیں تو پھر یہ نماز کس کی پڑھتے ہیں؟"

انھوں نے جواب دیا "ہم اپنا مرتبہ خود سمجھتے ہیں"

جس قیدخانے میں ابنِ منصوُر قید تھے' وہاں تین سو قیدی اور موجود تھے۔ انھوں نے ایک دن قیدیوں سے کہا "اگر تم لوگ خواہش کرو تو میں تمھیں رہا کرا سکتا ہوں"

قیدی انھیں دیوانہ سمجھتے تھے۔ ان میں سے کسی نے جواب دیا۔ "اگر تم میں اتنی ہی طاقت ہے تو تم خود کیوں رہا نہیں ہو جاتے؟"

ابنِ منصوُر نے کوئی جواب تو دیا نہیں' ایک ہلکا سا اشارہ کیا جس سے پیروں میں پڑی ہوئی زنجیریں ٹوٹ گئیں۔ قیدی حیرت سے ان کی صوُرت تکنے لگے۔ آپ نے قیدیوں سے کہا "تم میری صوُرت مت دیکھو بلکہ یہاں سے نکل بھاگنے کے لیے تیار ہو جاؤ"

قیدیوں نے کہا "قیدخانے کے کئی دروازے ہیں اور یہ سبھی مقفل ہیں۔ پیروں کی زنجیریں ٹوٹ جانے سے رہائی کا مسئلہ کہاں حل ہوتا ہے؟"

آپ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے اُنگلی سے کھُل جانے کا اشارہ کیا۔ دروازہ خود بخود کھُل گیا۔ آپ نے قیدیوں سے کہا "تم لوگ فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ جس طرح یہ دروازہ کھُلا ہے' اسی طرح بقیہ دروازے بھی کھلے ہوئے ملیں گے' تمھارا کام یہاں سے نکل جانا ہے۔

اب مزید دیر نہ کرو۔"

قیدی ابنِ منصوُر کے بغیر جانے پر آمادہ نہ تھے۔ انھوں نے کہا۔ "ہمارے ساتھ آپ بھی چلیے۔"

ابنِ منصوُر نے جواب دیا۔ "میں یہیں ٹھیرے رہنے پر پابند کر دیا گیا ہوں۔ تم ان چکروں میں مت پڑو، میں جو کہہ رہا ہوں، اس پر عمل کرو۔"

مجبوُراً سارے قیدی فرار ہو گئے۔

اس واقعے نے ایک تہلکا مچا دیا۔ آپ سے بہت سارے سوالات کیے گئے لیکن آپ نے انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ "مجھ سے جو پوچھنا ہے، صاف صاف پوچھو۔ میں نے سارے قیدیوں کو رہا کر دیا ہے۔ خود میں بھی فرار ہو سکتا تھا لیکن محض اس لیے رُک گیا ہوں کہ رسُول اللہؐ کا حکم ہے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے یا جو کچھ لکھا ہے تحفظِ شریعت کی خاطر میں اس کی سزا بھی بھُگت لوں۔"

لوگوں نے اس عجیب و غریب واقعے کی اطلاع خلیفہ کو دی اور درخواست کی کہ ابنِ منصوُر کے لیے جو فیصلہ مناسب ہو، فی الفور سنا دیا جائے کیونکہ یہ عجیب و غریب شخص کسی وقت بھی قید خانے سے فرار ہو سکتا ہے۔"

خلافت کی طرف سے حکم ملا کہ ابنِ منصوُر سے آخری بار ان کے انکار اور اعمال پر جرح کی جائے، اگر وہ اس سے تائب ہو جائیں تو انھیں چھوڑ دیا جائے اور دوسری صوُرت میں علمائے عصر اور فقہائے عہد سے ان کے واجب القتل ہونے کا فتوا طلب کیا جائے اور فتوے کے حصُول کے بعد انھیں قتل کر دیا جائے۔"

فقیہانِ شہر اور علمائے عصر قید خانے میں ابنِ منصوُر سے ملے اور ان سے سوال کیا۔ "ابنِ منصوُر! تم 'انا الحق' کا نعرہ لگا کے اپنی خدائی کا اعلان کر رہے ہو، کیا یہ کفر نہیں ہے؟"

ابنِ منصوُر نے کہا۔ "تم لوگ اپنے سارے الزامات گنا دو، میں ان سب کا ایک ساتھ جواب دوں گا۔"

ان لوگوں نے ابنِ منصوُر کے وہ خطوط پیش کیے جو "من جانب ارحم الرّاحمین" سے شروع کیے گئے تھے۔ انھوں نے کہا۔ "کچھ عرصے پہلے تک تو ہم سب کا یہ خیال تھا کہ تم پیغمبری کا دعوا کرنے والے ہو لیکن تمھارے خطوط اور نعرۂ انا الحق سے یہ انکشاف ہوا کہ تم خدا ہو، آخر یہ سب کیا ہے؟"

ابنِ منصوُر نے جواب دیا۔ "میں نے اپنی خدائی کا دعوا کب کیا ہے، بلکہ یہ تو وہ چیز ہے جسے ہم صوفی عین الجمع (ارادۂ خداوندی کے ساتھ اتصالِ کامل) کہتے ہیں۔ میں نے اپنے خطوں میں "من جانب ارحم الرّاحمین" لکھا ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کاتب ہے اور خود میں

آلۂ کتابت۔"

جب خلیفہ کے سامنے یہ تاویل پیش کی گئی تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ انھیں قتل کر دیا جائے۔

جب یہ قتل کیے جانے کی غرض سے باہر لائے گئے تو لاکھوں تماشائی انھیں دیکھنے کی غرض سے جمع ہو گئے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی لوگوں نے پتھر مارنے شروع کر دیے۔ اس مجمع میں ابُوبکر شبلی بھی تھے، انھوں نے مٹّی کا چھوٹا سا ڈھیلا اٹھا کر ابنِ منصوُر کے مارا تو یہ پتھروں کی مار پر اُف نہ کرنے والا "آہ" کر بیٹھا۔ کسی نے پوچھا۔ "جناب پتھروں کی مار تو ہنسی خوشی جھیل گئے لیکن ذرا سے مٹّی کے ڈھیلے کی چوٹ سے کراہنے لگے، یہ کیا بات ہے؟"

ابنِ منصوُر نے جواب دیا۔ "یہ ڈھیلا شبلی نے مارا تھا جو میرا محرمِ راز ہے، نادانوں کے مارنے سے اذیت نہیں پہنچتی لیکن واقفِ حال کی مار برداشت نہیں ہوتی۔"

پہلے ان کے تین سو کوڑے لگائے گئے۔ کوڑے کی ہر ضرب پر کوڑے لگانے والے نے ایک پُراسرار آواز سُنی جو ابنِ منصوُر سے مخاطب تھی، وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی۔ "یا ابنِ منصوُر لاتخف۔ یا ابنِ منصوُر لاتخف (اے ابنِ منصوُر خوف زدہ مت ہو، اے ابنِ منصوُر خوف زدہ نہ ہو)۔ تین سو کوڑے کی ضربات اس طرح جھیل گئے کہ منہ سے اُف تک نہ کی۔ اس وقت آپ نے عربی کے یہ شعر پڑھے۔

ندیمی غیر منسوب الی شئ من الحیف ... سقانی مثل ما یشرب کفعل الضیف بالضیف
فلما دارت الکاس دعا بالنطع والسیف ... کذا من یشرب الراح مع التنین بالصیف

(میرا ندیم ذرا سا بھی ظالم نہیں ہے۔ اس نے مجھ کو ایسی شراب عطا کی ہے جو میزبان مہمان کو دیا کرتا ہے اور جب جام کے کئی دور چل چکے تو اس نے تلوار اور چمڑے کی بساط طلب کی اور کہا کہ اس شخص کی یہی سزا ہے کیونکہ اس نے اژدہے کے سامنے سخت گرمی میں شراب پینے کی جسارت کی ہے)

قتل کیے جانے سے کچھ دیر پہلے کسی نے پوچھا۔ "عشق کیا ہے؟"

جواب دیا۔ "آج، کل اور پرسوں میں اس کا جواب موجود ہے۔"

ابُوبکر شبلی نے سوال کیا۔ "تصوّف کسے کہتے ہیں؟"

ابنِ منصوُر نے جواب دیا۔ "تم جو کچھ دیکھ رہے ہو، یہ تصوّف کا ادنا درجہ ہے اور اس کے اعلا درجے سے کوئی بھی واقف نہیں۔"

انھیں قید خانے کے باہر سیڑھی پر کھڑا کر دیا گیا، جلاد آگے بڑھا اور آپ کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے۔ آپ نے اُف کیے بغیر فرمایا۔ "گو میرے ظاہری ہاتھ کاٹ دیے گئے ہیں لیکن باطنی ہاتھ محفوظ ہیں،

انھیں کون کاٹ سکتا ہے‘ اور یہی وہ ہاتھ ہیں جنھوں نے ہمت کا تاج عرش کے سر سے اُتار لیا ہے۔“

جلاد کوئی پروا کیے بغیر پیروں کی طرف رجوع ہوگیا اور دونوں پیر کاٹ ڈالے۔ آپ نے فرمایا: ”تم نے میرے ظاہری پاؤں کاٹ دیے‘ کوئی پروا نہیں کیونکہ ابھی باطنی پاؤں موجود ہیں اور تم انھیں نہیں کاٹ سکتے۔ اور یہی وہ پاؤں ہیں جن سے میں اب بھی دونوں عالم کا سفر کرسکتا ہوں۔“

اس کے بعد آپ نے خون کے فوارے چھوٹتے ہوئے ہاتھ چہرے سے لگالیے اور کہا: ”لوگو! میری جواں مردی تم بھی دیکھ لو‘ میں سُرخ رو ہوں کیونکہ خون جواں مردوں کا اُبٹن ہوتا ہے۔“

پھر ہتھیلیوں اور انگلیوں سے محروم ہاتھوں کو کہنیوں سے لگا لیا اور بہتے ہوئے خون کو کہنیوں پر پھیرتے ہوئے کہا: ”لوگو! میں نمازِ عشق کے لیے وضو کر رہا ہوں کیونکہ عشق کی نماز خون کے وضو کے بغیر ادا نہیں کی جاسکتی۔“

اس کے بعد آنکھوں کی باری آگئی اور دونوں آنکھیں بھی نکال لی گئیں۔ آنکھوں کے بعد زبان کا نمبر آگیا۔ آپ نے کہا: ”بس ذرا توقف کرو اور مجھے ایک بات کہہ لینے دو۔“ اس کے بعد اوپر دیکھتے ہوئے کہا: ”اے اللہ! میرے ہاتھ پیر تیرے راستے میں کاٹ دیے گئے‘ آنکھیں تیرے لیے نکال لی گئیں۔ ذرا دیر بعد زبان بھی کاٹ دی جائے گی۔ میں تیرا شکر گزار ہوں کہ تو نے مجھے یہ حوصلہ بخشا کہ میں یہ ساری اذیتیں اُف کیے بغیر جھیل گیا۔ اب میری تجھ سے التجا ہے کہ تو نے جس دولت سے مجھے سرفراز کیا ہے‘ اس سے ان سب کو بھی نواز دے۔“

پھر ایک ادائے خاص سے فرمایا: ”یکتا کی دوستی بھی یکتا کردیتی ہے۔“

اس کے بعد زبان بھی کاٹ دی گئی اور سب سے آخر میں سر قلم کردیا گیا۔ کہتے ہیں اس وقت ہر طرف سے ’انا الحق‘ ’انا الحق‘ کی آوازیں آرہی تھیں۔ دوسرے دن لاش جلادی گئی اور تیسرے دن ان کی راکھ دریائے دجلہ میں بہادی گئی۔

ابوبکر شبلی کو اس سانحے سے بڑا دُکھ پہنچا۔ ابنِ منصور جس جگہ قتل کیے گئے تھے‘ شبلی وہاں رات بھر عبادت کرتے رہے۔ صبح کے وقت انھوں نے مناجات میں خدا سے سوال کیا: ”الٰہ العالمین! ابنِ منصور کی بابت جہاں تک میں جانتا ہوں وہ ایک مومن تھا اور ایک ایسا عارف اور محب جو وحدانیت پرست تھا‘ تو نے اسے اتنی اذیتوں سے قتل کرادیا۔ یہ کیا بات ہے؟“ اسی عالم میں شبلی پر غنودگی کا غلبہ ہوا۔

انھوں نے سُنا کوئی کہہ رہا تھا: ”ہم نے ابنِ منصور کے ساتھ یہ سلوک اس لیے کرایا کہ وہ ہمارے رازوں کو برملا ظاہر کرتا پھرتا تھا۔“

کچھ دنوں بعد شبلی نے ابنِ منصور کو خواب میں دیکھا۔ شبلی نے پوچھا: ”ابنِ منصور! کہو کیسے ہو؟ خدا نے تم سے کیسا سلوک کیا؟“

ابنِ منصور نے جواب دیا: ”مجھے یہاں مقامِ صدق عطا ہوا ہے۔“

شبلی نے پوچھا: ”ابنِ منصور! یہ تو بتاؤ‘ جب تک تم دُنیا میں رہے تمھارا دو گروہوں سے واسطہ رہا۔ ایک تو وہ جو تمھاری عزت کرتا تھا اور تمھیں حق پر سمجھتا تھا اور دوسرا وہ جو تمھیں بُرا کہتا تھا اور جس نے تمھیں قتل کرادیا۔ اس کی بابت تمھاری کیا رائے ہے؟“

ابنِ منصور نے مسکرا کر جواب دیا: ”شبلی! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں جو کچھ دنیا میں کہتا تھا‘ اس سے منحرف ہوگیا ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ پہلا گروہ جس نے مجھے پہچان لیا تھا میرے ساتھ اچھی طرح پیش آیا اور مجھ پر مہربانیاں کیں اس پر خدا نوازشیں فرمائے گا اور دوسرا گروہ جو مجھے پہچاننے سے قاصر رہا اور اس نے میرے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا خدا اسے بھی اپنی مہربانیوں سے نوازے گا اور ان کی خطائیں معاف کر دی جائیں گی۔“

شبلی نے حیرت سے پوچھا: ”وہ کیوں؟“

ابنِ منصور نے جواب دیا: ”محض اس لیے کہ دوسرے گروہ نے جو کچھ کیا‘ خدا کے لیے کیا تھا‘ وہ حق پر حرف آتے ہوئے نہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ انسانی دعوائے خدائی پر خاموش نہ رہ سکتا تھا۔“

جس شخص نے قتل کیے جانے سے پہلے ابنِ منصور سے پوچھا تھا کہ عشق کیا ہے؟ اور آپ نے یہ جواب دیا تھا کہ ”آج کل اور پرسوں میں اس کا جواب موجود ہے۔“ ان تین دنوں میں جو کچھ ابنِ منصور پر بیت گیا تھا اس سے سوال کرنے والا لرز گیا اور حالتِ سراسیمگی میں کہا: ”اگر یہی عشق ہے تو عشق کے کتنے دعوے دار اس راہ پر چلنے کا دعوا کرسکتے ہیں؟ شاید ایک بھی نہیں۔“

انسان کے گرد مختلف ناموں کی بہت ساری دیواریں کھڑی کردی گئی ہیں اور یہ دیواریں خود انسان نے کھڑی کی ہیں‘ اپنے اقوال اور افعال کا پابند اور افکار کے اظہار میں مجبورِ محض اور شاید یہی وہ بوجھ ہے جس کو اٹھانے سے فرشتوں تک نے انکار کردیا تھا‘ انسان نے اسے اٹھالیا اور اس کی سزا بھگت رہا ہے ورنہ ؎

مشکل ہے تو ایک ہماری‘ دار کا خطرہ رہتا ہے
ورنہ موجودات کا ذرّہ ذرّہ ’انا الحق‘ کہتا ہے!